بیادِ رفتگان

زیبا افتخار/ نگار سجاد ظہیر

عباس اطہر (مئی ۲۰۱۳ء، لاہور)

عباس اطہر مشہور شاعر و صحافی تھے۔ ۱۲/ اپریل ۱۹۳۹ء کو مغل پورہ، لاہور کے قریب ایک گاؤں تاج پورہ میں پیدا ہوئے۔ والد عبدالرحیم شاہ بسلسلہ ملازمت جھنگ میں مقیم تھے لہٰذا ان کا بچپن جھنگ میں گذرا۔ ایف۔اے تک تعلیم ساہی وال سے حاصل کی پھر پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے لاہور سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد کراچی چلے آئے۔ یہاں شوکت صدیقی کے روزنامہ ''انجام'' سے انہوں نے اپنے صحافیانہ کردار کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ امروز (لاہور)، آزاد (لاہور) میں بھی کام کرتے رہے اور پھر پیپلز پارٹی کے اخبار ''مساوات'' کے مدیر بنائے گئے۔ ان دنوں ذولفقار علی بھٹو کے خلاف محمد احمد قتل کیس کا مقدمہ چل رہا تھا، ان کی جرأتمندانہ تحریروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ لاہور میں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اسی دوران انہیں امریکہ میں سیاسی پناہ مل گئی۔ سات آٹھ سال بعد واپس آئے جب سیاسی فضا بدل چکی تھی، انہوں نے پھر صحافت کا پیشہ ہی اختیار کیا اور شام میں نکلنے والے اخبار ''سیاست'' سے وابستہ ہو گئے، اس کے علاوہ مختلف اوقات میں نوائے وقت (لاہور)، دی نیوز (لاہور) سے بھی وابستہ رہے۔ نوائے وقت میں 'کنکریاں' کے نام سے چھپنے والے ان کے کالم نے ادبی و صحافتی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔

وہ عوامی انقلابی شاعر تھے۔ اس حوالے سے ان کی منظومات ''ذکر''، ''کہا سنا'' اور ''آواز دے کے دیکھ لو' شائع ہوئیں۔ ان کا مجموعہ 'کہا سنا' اشاعت کے بعد ضبط کر لیا گیا۔ انہوں نے بہت سی تحریکی نظمیں لکھیں جس میں بھٹو کے نظریے اور پیپلز پارٹی سے وابستگی جھلکتی ہے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۳ برس تھی۔

انوار فیروز (جولائی ۲۰۱۳ء، راولپنڈی)

زندانِ آرزو سے کوئی بولتا نہیں
کیا لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مرگئے؟

اس شعر کے خالق انوار فیروز جولائی ۲۰۱۳ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کا نام انوار احمد خان ہے، ۵/جون ۱۹۳۸ء کو حصار، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کا خاندان اٹک (کیمبل پور) میں آباد ہوا۔ گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ ملازمت کی۔ ۱۹۶۲ء میں روزنامہ 'تعمیر' راولپنڈی میں چیف رپورٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ایم۔ اے کیا۔ دسمبر ۱۹۷۵ء سے روزنامہ 'نوائے وقت' راولپنڈی سے منسلک تھے۔ 'سمندر مضطرب ہیں' کے عنوان سے وہ اپنا شعری مجموعہ مرتب کر رہے تھے، جو تا حال شائع نہیں ہو سکا۔

فرمان فتح پوری (۳/اگست ۲۰۱۳ء، کراچی)

ممتاز نقاد، ماہرِ لسانیات اور درس و تدریس سے وابستہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ۳/اگست کو ۸۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، ان کی تدفین کراچی میں عمل میں آئی۔

ان کا خاندانی نام سید ولدار علی تھا۔ وہ ۲۶/جنوری ۱۹۲۶ء کو فتح پور (ہسوہ) میں پیدا ہوئے۔ سات سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، جو پولیس ملازمت میں تھے۔ ابتدائی تعلیم نواحی گاؤں کے ایک مدرسے سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد ہی خاندان کی کفالت کے خیال سے مسلم ہائی اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ شاعری اور لکھنے لکھانے کا شغل اسی وقت سے جاری رہا۔ شاعری کا یہ ذوق عمر بھر ان کے ساتھ رہا، لیکن جب تحقیق و تنقید کی طرف آئے تو شاعری پس منظر میں چلی گئی۔

فرمان صاحب نے ایف۔ اے کا امتحان پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے الٰہ آباد بورڈ سے کیا۔ ۱۹۵۰ء میں بی۔ اے کیا، اس دوران شادی ہو گئی، اس کے بعد یہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی، ابتداء میں چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں اور تعلیمی سلسلے کو بھی جاری رکھا۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کا امتحان اوّل بدرجہ اوّل پاس کیا اور اسی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ یہیں سے ''اردو میں منظوم داستانیں'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۶۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی پہلی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز بھی انہیں کو حاصل ہے۔ ان کی عالمانہ تحقیقی کتاب کا عنوان تھا ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''۔ انہوں نے جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں تیس سال تدریسی خدمات انجام دیں اور صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۸۵ء میں انہیں اُردو ڈکشنری بورڈ کا چیف ایڈیٹر اور سکریٹری مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک اور امتیاز ''نگار'' کی ادارت ہے۔ رسالہ ''نگار'' جسے نیاز فتح پوری نے آگرہ سے ۱۹۲۲ء میں جاری کیا تھا۔ اُسے کراچی سے جاری کرنے کی اجازت فرمان صاحب نے نیاز فتح پوری سے حاصل کر لی تھی۔ لہٰذا 'نگار' بیک وقت لکھنو اور کراچی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۶۶ء میں نیاز فتح پوری کے انتقال کے بعد 'نگار' کی ادارت فرمان صاحب نے ہی کی اور کراچی

ہیں ''نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر'' کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ان کی پوری زندگی تصنیف وتالیف میں گذری، چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں، ''اردو کی منظوم داستانیں''، ''اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ''اقبال سب کے لیے''، ''رباعی کا فنی اور تاریخی ارتقاء''، ''اردو کی نعتیہ شاعری''، ''ہندو مسلم تنازعہ''، ''ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں''، ''میرانیس حیات وشاعری''، ''غالب شاعرِ امروز وفردا''، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار''، ''نیا پرانا ادب''، ''نیاز فتح پوری دیدہ وشنیدہ''، ''فن تاریخ گوئی اور اس کی روایات''، ''قمر زمانی بیگم''، ''نواب مرزا شوق کی مثنویاں''، ''تحقیق وتنقید''، ''زبان اور اردو زبان''، ''اردو املا اور رسم الخط'' وغیرہ۔ان کتابوں کے علاوہ ان کے متعدد مقالات، مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے انہیں ستارۂ امتیاز عطا کیا گیا۔

سعید احمد اختر (۲۰ر اگست ۲۰۱۳ء، ڈیرہ اسماعیل خان)

غزل کے ممتاز شاعر سعید احمد اختر ۲۰ر اگست کو ڈیرہ اسماعیل خان میں تقریباً اسّی سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔وہ مارچ ۱۹۹۲ء میں کمشنر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔سبکدوشی کے بعد ان کی دلچسپی کا محور اردو ادب تھا۔ان کی شاعری کے دس مجموعے شائع ہوئے، جن میں دیار شب (۱۹۷۶ء)، سطحِ آب (۱۹۷۸ء)، چاندنی کے سائے (۱۹۸۱ء)، خواب گہنے (۱۹۸۴ء)، لے گئی پون اُڑا (۱۹۸۷ء)، پتا ٹوٹا ڈال سے (۱۹۸۷ء)، پوجا کے پھول (۲۰۰۱ء)، ورشا انجلی (۲۰۰۲ء)، Songs From The Desert (۲۰۰۳ء) اور اب کے بچھڑے کب ملیں گے (۲۰۰۷ء) شامل ہیں۔انہیں اباسین آرٹس کونسل کا پہلا انعام بھی ملا۔۳ر مارچ ۱۹۳۲ء کو پشین، بلوچستان میں پیدا ہونے والے سعید احمد اختر، ڈیرہ اسماعیل خان میں آسودہ خاک ہوئے۔

وہ آج کل بڑی نرمی سے پیش آتا ہے
کہیں یہ ترک تعلق کی ابتداء تو نہیں

محمود واجد (۲۴ر اگست ۲۰۱۳ء، کراچی)

افسانہ نگار، نقاد اور مدرّس محمود واجد، کراچی میں انتقال کر گئے۔وہ ۲۷ر مارچ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔سقوط ڈھاکہ کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان سے کراچی آ گئے، یہاں جامعہ کراچی میں کامرس کے استاد رہے، ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنا رسالہ ''آئندہ'' جاری کیا، جو چند برس پہلے تک باقاعدگی سے چھپتا رہا۔افسانوں کا پہلا مجموعہ ''خزاں کے پھول بہار کے دن'' ۱۹۶۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ ''موسم کا مسیحا'' ۱۹۸۸ میں کراچی سے چھپا۔افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''لمحہ لمحہ زندگی'' بھی کراچی سے شائع ہوا، اس کے علاوہ تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کی دو کتابیں 'ابوالکلام آزاد: آثار و افکار اور فکشن کی تنقید' تھیں۔''آئندہ'' کا آخری پرچہ ترتیب دے دیا تھا لیکن شائع نہ کر سکے۔

پروفیسر طٰہ خان (۲۶ر اگست ۲۰۱۳ء، پشاور)

معروف مزاح نگار طٰہ خان پشاور میں انتقال کر گئے۔ ان کی پیدائش لکھنو میں ۲ر فروری ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان آئے اور پشاور میں مستقلاً آباد ہو گئے۔ وہاں کے حلقۂ ادب میں مزاح نگاری کے حوالے سے معروف تھے۔ دو اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

مسلماں ہوں مگر یہ سوچ کر مرنے سے ڈرتا ہوں
نہ جانے کس کے گھر جائے بلائے ناگہاں میری
محلّے بھر کی دیواروں پہ سر ہی سر نظر آئے
مرے بچوں نے جس دم لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ڈاکٹر سید عبدالباری (یکم ستمبر ۲۰۱۳ء)

طلب ہے یہ کہ چراغ رہ حیات ہوں ہم

طلب سچی تھی، ڈاکٹر سید عبدالباری راہ حیات کے روشن چراغ ثابت ہوئے، جس کی روشنی سے دارالمصنفین اور معارف بھی منور ہوتا رہا۔ علمی و ادبی دنیا روشن رہی اور شاعری کا گوشہ بھی جگمگاتا رہا۔

۷ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو ٹانڈہ اکبر پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کے مراحل لکھنو اور گورکھپور میں طے کیے۔ اردو اور انگریزی زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا، ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، کچھ وقت سلطان پور کے ایک کالج میں استاد رہے اور پھر اودھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی امتیازی شان حاصل رہی۔ ان کی تحریروں میں ''لکھنو کا شعر و ادب (۱۸۵۷ء تک)''، ''لکھنو کے ادب کا ثقافتی اور معاشرتی مطالعہ''، ''ہندوستانی تہذیب اور اردو''، آزادی کے بعد اردو شعر و ادب''، ''ادب اور وابستگی''، ''نقد نو عیار''، ''افکار تازہ''، ''کاوش نظر''، ''آداب شناخت''، ''تراوش خیال''، ''بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ''، ''نئی خوشبو نئے خواب''، ''اسماء الحسنٰی اور کردار سازی''، وغیرہ اہم ہیں۔ ایک سفر نامۂ حج بھی تحریر کیا، جس کا عنوان ''جلوے ہیں بے شمار'' ہے۔ شعری مجموعوں میں ''فکر انگیز'' اور ''طرب خیز'' مشہور ہوئے۔ آپ کا تخلص ''شبنم سبحانی'' تھا۔ نوعمری میں ایک رسالہ بھی نکالتے رہے، جس کا نام ''دوام'' تھا، یہ رسالہ اُن کی فکری، ادبی اور شعری صالحیت کا مظہر تھا۔

دارالمصنفین سے خاص وابستگی تھی۔ باقاعدگی سے یہاں کے سیمناروں میں شرکت کیا کرتے تھے اور ان کے مقالے اور مراسلے معارف کی زینت بنتے رہے۔ یکم ستمبر ۲۰۱۳ء کو ۷۶ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے اور اپنے پیچھے علمی و ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔

شفیع عقیل (۶ ستمبر ۲۰۱۳ء، کراچی)

ممتاز صحافی، ادیب اور نقاد شفیع عقیل، ۶ ستمبر کو ۸۳ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد، کراچی میں انتقال کر گئے۔

وہ ۱۹۳۰ء میں لاہور کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے، محلّے کی مسجد میں قرآن ناظرہ کی تعلیم حاصل کی۔ مالی تنگی کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے کسی مدرسے، اسکول، کالج یا یونی ورسٹی کا منھ تک نہ دیکھا لیکن اپنے ذوق وشوق کی وجہ سے اس کمی کو از خود پورا کیا۔ ان کے والد معمولی راج تھے اور اپنے گاؤں کے گھروں کی تعمیر و مرمت سے رزق حاصل کرتے تھے۔ شفیع عقیل بھی روزانہ مزدوری کرنے لگے، لیکن لکھنے پڑھنے کے شوق کو دبا نہ سکے لہٰذا انہوں نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پنجاب یونی ورسٹی سے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے پاس کر لیے۔

قیامِ پاکستان کے تناظر میں ان کی پہلی کتاب ''خون ہی خون'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ افسانوں کا مجموعہ تھا جس کی اشاعت کے وقت شفیع عقیل کی عمر صرف بیس برس تھی، اسی سال وہ کراچی آ گئے اور معروف مزاحیہ شاعر مجید لاہوری کے پندرہ روزہ رسالے ''نمکدان'' سے وابستہ ہو گئے، جس میں وہ مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ ان کی اگلی وابستگی روزنامہ ''جنگ'' کراچی سے ہوئی۔ جس سے وہ ۶۳ برس تک وابستہ رہے۔

ان کی ادبی تخلیقات، اردو اور پنجابی، دونوں زبانوں میں ہیں۔ بھوکے (افسانے، ۱۹۵۳ء)، ایک آنسو ایک تبسم (طنز و مزاح، ۱۹۵۷ء)، ڈھل گئی رات (طنز و مزاح، ۱۹۵۷ء)، تیغ ستم (طنز و مزاح، ۱۹۶۳ء)، سوچاں دی زنجیر (پنجابی شاعری، ۱۹۷۵ء)، سیر و سفر (سفرنامہ، ۱۹۸۰ء)، زہر پیالا (پنجابی شاعری، ۱۹۸۰ء)، جاپانی لوک حکایتیں (ترجمہ، ۱۹۸۳ء)، جرمن لوک کہانیاں (ترجمہ، ۱۹۸۴ء)، ایرانی لوک کہانیاں (ترجمہ، ۱۹۸۶ء)، سیف الملوک (تلخیص و ترجمہ، ۱۹۹۰ء)، ادب اور ادبی مکالمے (ناموراد یبوں سے گفتگو، ۲۰۰۲ء) مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں (۲۰۰۴ء)، پیرس تو پھر پیرس ہے (سفرنامہ، ۲۰۰۴ء)، زندگانی پھر کہاں (سفرنامہ، ۲۰۰۵ء)، مجید لاہوری: سوانح، تحقیق و تنقید، پنجابی کے پانچ قدیم شاعر وغیرہ۔

شفیع عقیل نے شادی نہیں کی، اپنی بیوہ بہن اور ان کے بچوں کے ساتھ زندگی گذار دی، ان کے تحقیقی و تنقیدی کام کو متعدد اداروں نے سراہا اور اعزازات پیش کیے۔ ۲۰۰۴ء میں تمغۂ امتیاز سے نوازے گئے اور ۲۰۱۳ء میں تخلیق ایوارڈ دیا گیا۔

وفا کے شہر میں بھٹکی ہیں چاہتیں کیا کیا
فضا میں چیختی پھرتی ہیں وحشتیں کیا کیا
تمہارے قرب میں جانے وہ ہجر کیسا تھا
بچھڑ گئے تو ملی ہیں رفاقتیں کیا کیا
کوئی عقیل سے پوچھے، تلاش کس کی ہے
غبارِ راہ بنی ہیں محبتیں کیا کیا

احمد ہمیش (۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء، کراچی)

بے لوث افسانہ نگار، شاعر، مدیر 'تشکیل'، احمد ہمیش کراچی میں انتقال کر گئے اور کراچی ہی میں ان کی تدفین ہوئی۔

ان کا اصل نام احمد قریش صدیقی تھا، یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو ضلع بلیا، یوپی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم انٹر تک حاصل کی اور اپنی علمی استعداد کو بھرپور مطالعے اور محنت سے پورا کیا۔ وہ کئی زبانوں کے ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ احمد ہمیش نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۸ء میں شاعری سے کیا۔ انہوں نے زیادہ تر نثری نظمیں لکھیں۔ انہوں نے پہلی کہانی ۱۹۶۳ء میں 'بے زمینی' کے عنوان سے لکھی، افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۶ء میں 'مکھی' کے عنوان سے بھارت میں شائع ہوا۔ ان کے نظموں کا مجموعہ 'ہمیش نظمیں' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ وہ ایک سہ ماہی ادبی جریدے 'تشکیل' کے مدیر بھی تھے تاہم چند پرچوں کے بعد یہ ادبی جریدہ بند ہو گیا۔ وہ اپنی خودنوشت بھی لکھ چکے تھے۔

پروفیسر شعیب اعظمی (۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء، دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اور صدر شعبہ، پروفیسر شعیب اعظمی ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء کو دہلی (انڈیا) میں انتقال کر گئے۔

پروفیسر شعیب اعظمی کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد حکیم محمد اسحٰق ایک کامیاب طبیب اور تحریکِ آزادی کے اہم اور سرگرم کارکن تھے۔ دارالمصنفین سے گہرا تعلق تھا۔ شعیب اعظمی ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ایک حادثے میں پیر سے معذور ہو گئے تھے، لیکن بلند حوصلگی نے انہیں کبھی شکست تسلیم نہ کرنے دی، اپنی کوششوں سے اپنے لیے ایک نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ حفظ القرآن اور ابتدائی تعلیم کے بعد ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پرائیوٹ دیئے۔ ۱۹۵۵ء میں شبلی کالج سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کی سند حاصل کی اور ۱۹۵۹ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی۔ایڈ کی سند لی، پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۶ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس دوران وہ بمبئی کے انجمنِ اسلام ہائی اسکول میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

شعیب اعظمی کا تعلیمی سفر یہاں ختم نہ ہوا بلکہ وہ دہلی چلے آئے اور دہلی یونیورسٹی سے فارسی زبان و ادب کے لیے کام کیا، اُن کے پی ایچ۔ڈی کے مقالہ کا موضوع ''فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق'' تھا۔ ۱۹۷۲ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بحیثیت لیکچرار خدمات انجام دینے لگے۔ یہاں ترقی کرتے ہوئے آپ پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچے۔

قلم سے رشتہ پرانا تھا۔ ابتداً کہانیاں اور مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ بعد میں فارسی سے دلچسپی بڑھی تو اُن کی کئی علمی اور تحقیقی نگارشات فارسی ادیب اور تاریخ کے حوالے سے سامنے آئیں۔ ان کی تصانیف میں ''پروانہ چراغ مزار خودیم ما''، ''ایران کا سفرنامہ''، ''صحبتِ یار آخر شد''، ''بطواف کعبہ رفتم''، ''فارسی ادب بعہد سلاطینِ تغلق''، ''قصہ ہائے رنگ''، ''کوراد غلو'' اور ''گاہے گاہے باز خواں'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی و ادبی مقالے سپردِ قلم کیے۔

زندگی بھر قرطاس وقلم سے رشتہ جوڑے رکھنے والے، نہایت شریف، وضع دار، نرم گفتار شعیب اعظمی ۲۸ ستمبر کو خاموشی سے چلے گئے۔ فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے علمی حلقوں میں ان کی کمی بطورِ خاص شدّت سے محسوس کی جائے گی۔

داؤد رہبر (۶ر اکتوبر ۲۰۱۳ء، فلوریڈا)

امریکہ میں رہ کر خوبصورت اسلوب میں اردو نظم ونثر لکھنے والے ادیب، شاعر اور تاریخ مذہب کے استاد، داؤد رہبر ۶ر اکتوبر کو ۸۶ برس کی عمر میں، فلوریڈا میں انتقال کر گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت جلا دی گئی اور راکھ فلوریڈا کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔

داود رہبر مئی ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام ڈاکٹر شیخ محمد اقبال تھا، جو فلسفے کے اُستاد اور حافظِ قرآن تھے۔ ان کا شمار عربی اور فارسی کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا تھا، وہ اورینٹل کالج، لاہور کے استاد تھے، بعد میں اسی کالج کے پرنسپل بھی رہے۔

داؤد رہبر نے سنٹرل ماڈل اسکول سے ۱۹۴۰ء میں میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے عربی میں ایم۔اے کیا، کچھ عرصے تک اورینٹل کالج، لاہور میں عربی زبان وادب کے معلّم کے طور پر وابستہ رہے پھر ۱۹۴۹ء انگلستان چلے گئے، کیمبرج سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد داؤد رہبر ۱۹۵۳ء تک انگلستان میں ہی قیام پذیر رہے، اس کے بعد انہیں ترکی، کینیڈا اور امریکہ میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے مواقع ملے۔ ترکی میں قیام کے دوران انہوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ ۱۹۶۸ء میں بوسٹن یونی ورسٹی میں انہیں تاریخِ مذاہب کا معلم مقرر کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے تو مستقل قیام کے لیے فلوریڈا کو منتخب کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے زیادہ تر اردو میں لکھا اور زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کے جرائد میں چھپتے رہے۔ موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے ممتاز گائیکوں پر ایک سلسلۂ مضمون لکھا جو پہلے دہلی اور پھر لاہور سے ''باتیں کچھ سُریلی سی'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی اہم کتابوں میں پراگندہ طبع لوگ (خاکے)، مشاعرے کا فاتح (داغ دہلوی کی شخصیت وشاعری) اور کلچر کے روحانی عناصر شامل ہیں۔ ان کے خطوط ''سلام وپیام'' کے عنوان سے تین جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔

پروفیسر سید فخر الحسن (۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۳ء، کراچی)

گورنمنٹ لیاقت کالج، کراچی کے سابق پرنسپل، مدرس اور ایک وضعدار علمی شخصیت سید فخر الحسن، ۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۳ء کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی تدفین کراچی میں ۲۴ر اکتوبر کو عمل میں آئی۔

سید فخر الحسن صاحب پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ کے اسکول سے حاصل کی پھر سندھ مسلم کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد سندھ یونیورسٹی میں بی اے آنرز میں داخلہ لیا۔ ان کا شعبہ تاریخ اسلام تھا۔ ایم اے کرنے کے لیے کراچی چلے آئے اور جامعہ کراچی سے تاریخ اسلام ہی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں جامعہ کراچی کے شعبہ علوم اسلامیہ سے ایم اے کی دوسری سند حاصل کی۔

سید فخر الحسن صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا اور ترقی کر کے پروفیسر کے عہدے تک پہنچے،

آپ لیاقت گورنمنٹ کالج، کراچی کے پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کی مصروفیات گونا گوں تھیں، وہ ''مجلس علوم اسلامیہ'' کے صدر بھی تھے، تو دوسری طرف ''بزمِ عماد'' کی سرپرستی بھی کر رہے تھے۔ ''طلباءِ قدیم جامعہ کراچی'' کے نائب صدر اور ممبر سینیٹ جامعہ کراچی بھی رہے۔

ان کا خاص موضوع خلافت بنوامیہ تھا۔ اس حوالے سے انہوں نے ''قیامِ خلافت بنوامیہ'' بھی تصنیف کی تاہم تقریباً تیس سال سے ان کی علمی و تصنیفی دلچسپیوں کا مرکز سید سلیمان ندوی کی ذات اور شخصیت تھی، لہٰذا اُن کی زیادہ تر تحریریں سید صاحب کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی مشہور تصانیف میں ''علامہ سید سلیمان ندوی کی سیاسی خدمات'' اور ''سید صاحب'' ہیں۔ انہوں نے ''سوانح حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ'' بھی تحریر کی۔

شعبہ تاریخ اسلام سے پروفیسر صاحب کا تعلق دیرینہ تھا۔ اُن کے انتقال کی خبر علمی و ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ شعبہ تاریخِ اسلام، جامعہ کراچی میں نہایت دکھ کے ساتھ سنی گئی۔

ڈاکٹر صدیق جاوید (۲رنومبر ۲۰۱۳ء، لاہور)

خردمند اقبال شناس، ڈاکٹر صدیق جاوید ۲رنومبر ۲۰۱۳ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اقبال شناسوں کی فہرست میں ڈاکٹر صدیق جاوید کا نام اس لیے بھی اہم ہے، کہ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ پر تحقیقی و تنقیدی مضامین ہی نہ لکھے بلکہ چند اہم اقبال شناسوں کو بھی اپنا موضوع بنایا۔

صدیق جاوید، متحدہ پنجاب کے شہر جالندھر میں یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے (سرکاری کاغذات میں اُن کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۶ء ہے جو بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی درست نہیں) اُن کے والد چودھری دین محمد تجارت پیشہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں مقیم ہوا۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان ماڈل اسکول سے میٹرک کیا۔ مطالعہ کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ایف اے کی ڈگری لی اور ایک سال بعد ادیب فاضل کی سند بھی حاصل کر لی۔ ایم اے اردو میں داخلہ کے لیے اورینٹل کالج، لاہور کا انتخاب کیا۔ ایم۔ اے کے مقالہ کے لیے اپنا موضوع ''بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ'' منتخب کیا اور جب Ph. D کا مرحلہ آیا تو جو موضوع منتخب کیا اس کا عنوان تھا ''فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ''۔

کچھ عرصے بعد ڈاکٹر صاحب لاہور آ گئے اور یہاں گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۹۶ء یعنی ریٹائرمنٹ تک یہیں قیام کیا۔ لاہور قیام کے دوران آن کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا، لیکن اہم ترین موضوع اقبالیات ہی تھا۔ اُن کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں۔ اقبال پر تحقیقی مقالے، بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ، فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ، اقبال کی نئی تفہیم، اقبالیات راوی، اقبال اور اُن کا فلسفہ وغیرہ

اس کے علاوہ ان کی دو کتابیں ''ناطقہ سر بگریباں'' اور ''تحقیق کے چراغ تلے'' بوجوہ مشہور ہیں۔

ڈاکٹر صدیق جاوید کی ذاتی لائبریری بہت وسیع تھی اور اس میں ایسی نادر و نایاب کتابیں موجود تھیں کہ انہیں کسی تحقیقی کام

کے لیے کسی اور لائبریری سے رجوع نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اخری عمر میں اپنے بچوں کے پاس امریکہ آنا جانا رہتا تھا۔ گذشتہ دنوں دو ماہ امریکہ میں گزار کر آئے تو پھر دوبارہ جانا نصیب نہ ہوا۔ ۲رنومبر کی صبح اپنے کمرے میں ایسی حالت میں پائے گئے کہ تقریباً ۵ گھنٹے قبل روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ادبی دنیا ملول تھی کہ ایک اور صاحب نظر اور خردمند اقبال شناس اس جہاں سے اُٹھ گیا تھا۔

محبوب خزاں (۴ر دسمبر ۲۰۱۳ء، کراچی)

منفرد لہجے کے شاعر، محبوب خزاں، ۴ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ محبوب خزاں کی پہچان اُن کی شاعری تھی، انہوں نے شاعری کم کی، لیکن جو کی اس میں ایک جداگانہ جہان گفتگو تخلیق کیا اور شاعری کی ایک نئی روایت کو پروان چڑھایا۔

ان کا نام محبوب صدیقی اور خزاں تخلص ہے۔ یکم رجولائی ۱۹۳۰ء کو موضع چندائر، ضلع بلیا (یوپی) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم چندائر میں حاصل کی۔ بعدازاں گورکھ پور میں زیر تعلیم رہے۔ الٰہ آباد سے بی۔ اے پاس کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں سی ایس پی کا امتحان دیا اور لاہور میں اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل، پنجاب کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ترقی کر کے اکاونٹنٹ جنرل، سندھ کے عہدے سے ۳۰ رجون ۱۹۹۰ء کو ریٹائر ہوئے۔ محبوب خزاں کراچی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ''اکیلی بستیاں'' کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

خزاں اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں، جو غزل کے رسمی موضوعات و مضامین سے ہٹ کر شعر کہتے رہے۔ ان کی غزلوں کا بیشتر حصہ عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے، لیکن عشق میں ان کے مسائل دوسرے شاعروں سے بہت مختلف رہے ہیں۔ ''کم کہو، اپنا کہو، اچھا کہو'' یہ انہی کا مصرع ہے اور اس مقولے پر ان کی شاعری پوری اترتی ہے۔

محبوب خزاں کی انفرادیت کا سبب اُن کا سب سے الگ لہجہ اور باریک بین زاویہ نظر ہے۔ وہ قدیم شاعری اور جدید شاعری کے درمیان ایک پل تعمیر کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اُن کی شاعری میں دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ جدید شاعری کے تیزی سے بدلتے رجحانات میں 'میر' کی سی سادگی اور برجستگی واپس لانا آپ کا ہی حال تھا۔ محبوب خزاں کی شاعری کا سہل ممتنع ملاحظہ ہو۔

ایک محبت کافی ہے
باقی عمر اضافی ہے

نیلسن منڈیلا (۵ر دسمبر ۲۰۱۳ء، جنوبی افریقہ)

جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر اور نسلی امتیاز کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی علامت نیلسن منڈیلا، طویل علالت کے بعد ۵ر دسمبر کی رات اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ ان کی عمر ۹۵ سال تھی۔ نیلسن منڈیلا پھیپھڑوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔

۱۹۱۸ء میں جنوبی افریقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''تھیمبو'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدائشی نام ''رولیہلا ہلا'' تھا۔ ان کے ایک استاد نے اُن کا انگلش نام ''نیلسن'' رکھا اور پھر وہ اسی نام سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔

نیلسن ۹ سال کی عمر میں ہی یتیم ہو گئے تھے زندگی کے نشیب و فراز کو قریب سے دیکھنے والے نیلسن نے ۱۹۴۳ء میں

افریقن نیشنل کانفرنس میں بہ طور کارکن شمولیت اختیار کی اور اے۔این۔سی یوتھ ونگ کے بانی صدر بنے۔منڈیلانے وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جوہانسبرگ میں پریکٹس شروع کر دی۔لیکن آپ کی شہرت کی اصل وجہ نسل پرستی کے خلاف چلائی جانے والی مہم تھی۔انہوں نے جنوبی افریقہ میں سفید فام حکمرانوں سے آزادی کی جدوجہد کی خاطر ۲۷ سال جیل میں گزارے۔ خیال ہے کہ اُن کی موت کی وجہ بننے والی پھیپھڑوں کی بیماری کا آغاز بھی اسی قید کے زمانے میں ہوا تھا۔انہیں ۱۹۶۴ء میں بغاوت کے الزامات میں عمر قید کی سزا دی گئی تھی،لیکن ۱۹۹۰ء میں رہائی نصیب ہوگئی،۱۹۹۳ء میں نسل پرستی کے خلاف کوششوں کے اعتراف میں انہیں امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔اس کے اگلے ہی سال یعنی ۱۹۹۴ء میں وہ ملک کے پہلے سیاہ فام صدر منتخب ہوئے۔ صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی نسل پرستی کے خلاف اُن کا رویہ مثبت ہی رہا۔انہوں نے سفید فام گارڈ یا افسران کی جگہ سیاہ فام افراد کو بھرتی نہ کیا اور نسل پرستی کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار کیا۔۱۹۹۹ء میں صدارت کا عہدہ چھوڑنے کے بعد وہ جنوبی افریقہ کے اعلیٰ ترین سفیر بن گئے۔

نیلسن نے اپنی ۸۹ ویں سالگرہ پر دنیا بھر کی نمایاں شخصیات پر مشتمل ایک گروپ ''دی ایلڈرز'' قائم کیا،تاکہ تمام دنیا میں درپیش مسائل سے نمٹا جا سکے۔نیلسن منڈیلا مدبّر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دل عزیز سیاست دان بھی تھے۔اُن کو متعدد انعامات اور ایک سو سے زائد اعزازی ڈگریوں سے بھی نوازا گیا۔

ساری دنیا میں ان کے انتقال کی خبر صدمے سے سنی گئی۔اُن کی تدفین اُن کے آبائی گاؤں میں کی گئی۔

عبدالقادر ملاّ (۱۲/دسمبر ۲۰۱۳ء،ڈھاکہ)

پانچ سال میں دو مرتبہ دنیا کے بدعنوان ترین ممالک میں سرفہرست رہنے والے ملک بنگلہ دیش میں ۶۵ سالہ معلّم، صحافی اور سیاست دان عبدالقادر ملاّ (قیدی نمبر ۳۸۹،سینٹرل جیل ڈھاکہ،بنگلہ دیش) کو ۱۲/دسمبر ۲۰۱۳ء کو رات دس بجے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ع جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

عبدالقادر ملاّ ۱۹۴۸ء میں ضلع فرید پور کے ایک گاؤں،جوری یادونگی میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان ممتاز مذہبی حیثیت کا حامل تھا۔اُنہوں نے اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔میٹرک کا امتحان انہوں نے امیر آباد فضل الحق انسٹی ٹیوٹ سے درجہ اوّل میں پاس کیا۔فرید پور کے راجندرا کالج سے ۱۹۸۶ء میں گریجویشن کیا۔۱۹۶۹ء میں ایوب خان کے خلاف تحریک کے دوران گرفتار ہوئے۔۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے فزکس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا اور اسی سال اسلامی چھاترو شنگھو (اسلامی جمعیت طلبہ) کے رکن بنے۔

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک عروج پر پہنچی تو عبدالقادر ملاّ ان رضا کاروں میں شامل تھے جنہوں نے متحدہ پاکستان کے لیے مکتی باہنی کے مقابلے میں پاکستانی فوج کی مدد کی تھی۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور تدریس سے وابستہ ہوگئے۔۱۹۸۱ء میں ان

کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا اور روزنامہ ''سنگرام'' ڈھاکہ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مقرر ہوئے، جماعت اسلامی، بنگلہ دیش کی طرف سے انتخابات میں حصہ لیا اور دو بار اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ ۲۰۰۰ء میں جماعت اسلامی، بنگلہ دیش کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔

۲۰۱۰ء میں شیخ حسینہ واجد کے دورِ حکومت میں بنائے جانے والے متنازعہ جنگی جرائم ٹریبونل نے گڑے مردے اُکھیڑنے شروع کیے اور چالیس سال قبل کے واقعات پر مقدمات قائم کیے جانے لگے اور جماعت اسلامی اور بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہونے لگیں۔ عبدالقادر ملاّ کو بھی متعدد الزامات لگا کر فروری ۲۰۱۳ء میں گرفتار کر لیا۔ ٹریبونل نے انہیں عمر قید کی سزا سنا دی، حسینہ واجد کی حکومت نے سپریم کورٹ میں پھانسی کے لیے اپیل کی، لہٰذا عبدالقادر ملاّ کو ۱۲ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو ڈھاکہ کی سینٹرل جیل میں پھانسی دے دی گئی اور اگلے دن فجر سے پہلے ان کے آبائی گاؤں (فرید پور) میں تدفین کر دی گئی۔

دنیا بھر کے پینتالیس ممالک میں ان کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ بنگلہ دیش میں اس سیاسی عدالتی قتل کے خلاف شدید ہنگامے شروع ہو گئے۔ بنگلہ دیش کے اس نام نہاد انٹرنیشنل وار کرائم ٹریبونل نے، جس میں کوئی بھی غیر ملکی جج، وکیل یا مبصر شامل نہیں، مزید چار شخصیات کو پھانسی کی سزا سنا رکھی ہے۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون، امریکی وزیر خارجہ جان کیری اور ترک وزیر اعظم طیب اردگان نے ذاتی طور پر شیخ حسینہ واجد کو فون کر کے عبدالقادر ملاّ کو دی جانے والی پھانسی روکنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے ایسا کوئی فون بنگلہ دیشی حکومت کو نہیں کیا گیا۔

مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

لطیف الزمان خان (۲۶ر دسمبر ۲۰۱۳ء، ملتان)

معروف غالب شناس ادیب، لطیف الزمان خان ۲۶ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو ملتان میں انتقال کر گئے اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

لطیف الزمان خان ۱۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو بھیل واڑہ، راجستھان (ریاست میواڑ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پولیس میں تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی، اودھے پور سے میٹرک کیا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان آئے، کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۹ء میں لیکچرر کی ملازمت ملنے کے باعث وہ کراچی سے رحیم یار خان چلے گئے۔ پانچ سال بعد ملتان تبادلہ ہو گیا، جہاں پچیس سال گورنمنٹ کالج، بوسن روڈ میں انگریزی پڑھانے کے بعد ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہو گئے اور وفات تک ملتان میں ہی مقیم رہے۔

غالب ان کا پہلا اور آخری عشق تھا۔ غالب پر شائع ہونے والا بے شمار مواد ان کے پاس تھا۔ غالبیات پر اتنا بڑا خزانہ پاکستان میں شاید کسی اور کے پاس نہیں۔ تاہم غالبیات پر برصغیر کا سب سے بڑا اور منفرد ذخیرہ بمبئی، ہندوستان میں کالی داس گپتا رضا کے پاس تھا۔ غالب کے علاوہ ان کے ذاتی کتب خانے میں رشید احمد صدیقی کے حوالے سے بھی کتابوں کا گراں قدر ذخیرہ

تھا۔ان کے پاس مشاہیر کے چودہ ہزار سے زائد خطوط تھے، جواب سردار مسعود (جھنڈیر لائبریری، میلسی) کے پاس ہیں۔

ان کی مطبوعات میں خاکوں کا مجموعہ 'ان سے ملیے' (۲۰۰۴ء) مشہور ہے، اس کے علاوہ انہوں نے غالب کے فارسی خطوط کا اردو میں ترجمہ کیا، جو 'خطوط غالب' کے نام سے شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے پاس محفوظ 'مہر نیم روز' کے مخطوطے کا عکس اور اردو ترجمہ بھی شائع کروایا۔

❁❁❁